سیّد صاحب

عبدالشکور پٹھان، کینیڈا

"یہ کیا شیطانی حرکت ہے!" میرے بزرگ مجھ پر گرجے۔

"جی! کیا ہو گیا؟" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ تمہاری داڑھی ہے! ایسی داڑھی ہوتی ہے؟" میری چھدری سی داڑھی بزرگ کے غیض و غضب کا نشانہ تھی۔

"وہ ایک عالم دین ہیں اپنے پاکستان کے۔ ان کا کہنا ہے کہ داڑھی کے تقاضے زیادہ اہم ہیں بہ نسبت داڑھی کی مقدار کے۔ اور یہ کہ اسلام میں داڑھی ہے، داڑھی میں اسلام نہیں۔" میں نے منمناتی سی آواز میں صفائی پیش کی۔

"مجھے پتا ہے تم کس کی بات کر رہے ہو۔ نہ جانے کیا الا بلا پڑھتے رہتے ہو۔ وہ ایک گمراہ شخص ہے۔"

"اچھا، جی۔" میں نے گردن جھکا لی۔ بزرگ بڑے دیندار تھے، میں بھلا ان سے کیا بحث کرتا۔

"جھیڑے سو یہودی مرے تے اے پیدا ہویا۔" منبر پر بیٹھے رنگین پگڑی والے مولانا جمعہ کا وعظ فرما رہے تھے۔ یہ مضافات کی ایک چھوٹی سی مسجد تھی جہاں اکثریت پنجابی آبادکاروں کی تھی۔ میں پہلی بار یہ پنجابی اور اردو کا ملغوبہ سن رہا تھا۔ مولانا کی تقریر میں "بغیرت" "کنجر" اور کافر کے الفاظ بکثرت سنائی دے رہے تھے اور مسجد کے ماحول میں بہت ہی کثیف اور غلیظ محسوس ہوتے تھے لیکن مولانا کا جنون ہر گالی کے ساتھ بڑھتا ہی جاتا تھا۔

اور یہ میرے اپنے گھر میں میرے قریبی عزیز مدعو ہیں۔ بے تکلف باتیں ہو رہی ہیں۔ کسی بات پر مولانا مودودی کا حوالہ سننے میں آیا۔

"ارے آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟" یہ میرے ایک بہت ہی قریبی اور نوجوان عزیز ہیں۔ "ہمارے بڑے ابا سے ہم نے 'اُس' کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے سوال کیا کہ تم اگر بیمار ہو تو دوا کس سے لو گے، ڈاکٹر سے یا کمپاؤنڈر سے؟ یہ شخص وہ کمپاؤنڈر ہے۔"

میرے عزیز نے طنز آمیز ہنسی کے ساتھ بتایا۔ محفل میں کچھ اور لوگ بھی اس ہنسی میں شامل تھے۔

"تم نے پڑھا ہے انہیں؟" میں نے زخم خوردہ آواز میں سوال کیا۔

"نہیں، پڑھنے کی ضرورت کیا ہے۔ بڑے ابا کے حضرت صاحب بھی یہی کہتے ہیں۔"

میرا یہ عزیز بہت ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور ایک بہت بڑے ادارے میں بہت ہی بڑے عہدے پر فائز ہے۔

سیّد صاحب کا نام اپنوں کے سامنے جب بھی لیا کچھ ایسے ہی جملے سنائی دیے۔ لیکن جہاں میں کام کرتا ہوں، میرے ساتھ دنیا بھر کے لوگ کام کرتے ہیں جن میں عرب ممالک کے ساتھی بھی ہیں۔

یہ عبدالرحمٰن الحماش ہے۔ اردن کا رہنے والا۔ کسی بات پر عالم اسلام کے علماء کی بات ہو رہی ہے۔ وہ شیخ الشعراوی، شیخ القرضاوی اور شیخ البانی کے نام لیتے ہوئے اچانک سیّد مودودی کا نام لیتا ہے تو میں چونک پڑتا ہوں۔ وہ بتاتا ہے کہ سید صاحب کے حوالے اردن کی دینی گفتگو میں سنائی دیتے ہیں۔

اور یہ محمد اوزین (حسین) ہے۔ یہ الجزائری ہے۔ مودودی کے ذکر پر انہیں "امام مودودی" کہہ کر یاد کر رہا ہے۔ میرے استفسار پر کہتا ہے کہ ہمارے ہاں انہیں یہی درجہ دیا جاتا ہے۔ میں نے پاکستان میں سید صاحب کے ساتھ یہ سابقہ یا لاحقہ کبھی نہیں سنا۔

اور یہ میرا جذباتی سوڈانی ساتھی 'ہادی' ہے۔ ہادی جس نے ۲۹ مئی ۱۹۹۸ء کی صبح (جب میں دفتر میں سر جھکائے کام کر رہا تھا کہ میرے ہندوستانی ساتھی آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور مجھ سے بات کرنے سے کترا رہے تھے۔)، مجھے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا تھا اور پُرجوش آواز میں کہہ رہا تھا "مبروک، اللہ اکبر"

They did it!!! Six times!

ہادی کی آواز میں ارتعاش تھا۔ وہ مجھے پاکستان کے ایٹمی دھماکے کی مبارکباد کچھ یوں دے رہا تھا جیسے اس کے اپنے ملک نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔ اور یہ ہادی جب مجھ سے بات کرتا ہے تو جمال الدین افغانی، حسن البنا، محمد قطب، مہدی سوڈانی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نام لیتا رہتا ہے۔

میرے عرب ساتھی جس عقیدت اور محبت سے سیّد صاحب کی بات کرتے ہیں اسی قدر میں اپنے کسی پاکستانی دوست یا کسی محفل میں ان کا ذکر کرتے ہوئے گھبراتا ہوں کہ طعن و دشنام کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

اور یہ سب وہ ہیں جنھوں نے سید صاحب کی کسی کتاب کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا۔

اور پھر میں انہیں دیکھتا ہوں جو سید صاحب کی فکر کے اسیر ہیں اور ان کی تحریک سے وابستہ ہیں۔ یہ بڑے عجیب و غریب لوگ ہوتے ہیں۔ میں کراچی میں بہار کالونی جیسی پسماندہ بستیوں میں بھی رہا، کورنگی اور لانڈھی جیسے علاقوں میں بھی رہا اور سوسائٹی اور نارتھ ناظم آباد جیسے پڑھے لکھے لوگوں والے علاقوں میں بھی رہ چکا ہوں۔ ان تمام آبادیوں میں کچھ لوگوں کو دیکھا، باریش، سادہ لیکن صاف ستھرے لباسوں والے، تعلیم میں اپنے آس پاس کے لوگوں سے آگے اور کردار و اخلاق میں سب سے ممتاز۔ لوگ جن کی شرافت اور راست بازی کے معترف، محلے کی فلاح و بہبود کے کاموں میں سب سے آگے اور قابل اعتبار اور ایماندار۔ جی ہاں یہ وہ ہیں جو سید مودودی کی فکر کے متاثرین اور ان کی تحریک سے وابستہ ہیں اور ہر محلے میں اور ہر آبادی میں دوسروں سے مختلف نظر آئیں گے۔

مجھے پی آئی آئی اے (Pakistan Institute of Industrial Accountants) کے وہ سفید کرتا پائجامہ میں ملبوس غفور صاحب یاد آتے ہیں جن کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ہوتی تھی اور جنھیں طلبہ لیکچر کے بعد بھی گھیرے رہتے تھے۔ جی ہاں، یہ پروفیسر غفور احمد تھے، جماعت اسلامی کے رہنما۔

یہ سب اس تربیت اور تعمیر اخلاق کا پرتو تھے جو سید مودودی نے اپنے رفقاء اور پیروکاروں میں پیدا کی، اور جن کی تربیت سے ان کے رفقاء و کارکنان شرافت اور اعلیٰ کرداری کے اس درجے پر پہنچے ان کا اپنا کیا حال ہو گا۔

اور میرا اپنا یہ حال کہ سید صاحب کی تصویر دیکھتا ہوں تو نظریں احترام میں جھکتی چلی جاتی ہیں، ان کو پڑھتا ہوں تو ایک ایک بات دل و دماغ میں روز روشن کی طرح واضح ہوتی چلی جاتی ہے اور جب انہیں سنا تو ایک جہان حیرت میں گم ہو گیا کہ یہ اتنے بڑے، بلکہ یوں کہئیے کہ ہمارے دور کی سب سے بڑی شخصیت کی آواز اور ان کا کلام ہے۔ اتنا دھیما پن، اتنی سادگی، اتنے آسان ترین الفاظ میں گفتگو کہیں سے نہیں لگتا کہ یہ وہ ہستی ہے ایک دنیا جنھیں اپنا فکری رہنما مانتی ہے۔

اور بخدا یہ سید مودودی علیہ الرحمہ کے بارے میں کوئی مقالہ یا معلوماتی مضمون نہیں ہے۔ میں کیا اور میری اوقات کیا جو عالم اسلام کی اس عظیم ہستی کے بارے

الأوراق
ALAWRAAQ
Publications
www.alawraaq.com

میں کچھ کہہ سکوں، اور میرے پاس کہنے کے لئے ہے ہی کیا، سورج کی روشنی ہی اس کے وجود کی دلیل ہے۔ سید مودودی کی عظمت اور مرتبے سے کون واقف نہیں۔ یہ تو وہ اظہارِ عقیدت اور محبت ہے جو نجانے کب سے اس دل میں گھر کئے ہوئے ہے، بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس وقت سے جب میں سید صاحب کا پورا نام بھی نہیں جانتا تھا۔

چھٹی یا ساتویں جماعت کی بات ہے۔ ہمارے اردو کے استاد جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ ان کا طریقۂ تعلیم دیگر اساتذہ سے مختلف تھا۔ وہ نصاب سے کم پڑھاتے تھے لیکن تربیت کے دیگر پہلوؤں پر زیادہ توجہ رکھتے۔ ہم سے اکثر کہتے کہ کوئی سوال کرو۔ ہمیں اکثر قصے کہانیاں اور لطیفے بھی سناتے اور ان سے بہت بے تکلفی بھی تھی۔ کسی طالب علم نے سوال کیا کہ مولانا مودودی کو موت کی سزا کیوں ہوئی تھی۔ ہمارے استاد نے، ایثار عبداللہ جن کا نام تھا، کچھ قادیانی تحریک وغیرہ کے بارے میں بتایا جو کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن جو بات یاد رہی وہ یہ کہ مولانا نے سزا کو بہادری سے قبول کیا اور کوئی رحم کی اپیل نہیں کی اور یہ کہ بعد میں شاہ سعود اور عالم اسلام کے دیگر ممالک کی مداخلت کے سبب ان کی سزائے موت منسوخ کر دی گئی۔

لیکن اس کے بعد سے جو فرق سید صاحب میں اور دیگر علماء میں نظر آیا اور تازندگی ذہن پر سوار ہے وہ یہ کہ دیگر مفتیانِ کرام اور اہلِ جبہ و دستار تائید ستم اور حکومتِ وقت کی مدح سرائی کا کوئی موقع نہیں چھوڑتے اور ایک نہایت آرام دہ اور پر سکون زندگی گذارتے ہیں۔ دار و رسن کے تجربے اور قید و بند کی صعوبتوں سے انہیں کوئی علاقہ نہیں۔ اور یہ سید صاحب ہیں کہ تین فوجی افسر جنہوں نے ان پر مقدمہ چلایا، انہیں جیل کی کوٹھری میں سزا سنانے آتے ہیں کہ قادیانی مسئلہ نامی کتابچے کی اشاعت کے جرم میں آپ کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ آپ اس سزا کے خلاف اپیل نہیں کرسکتے، ہاں رحم کی درخواست کرسکتے ہیں اور ہمت و عزیمت کا یہ کوہِ گراں ان فوجیوں کو جواب میں کہتا ہے "مجھے تمہارے رحم کی ضرورت نہیں۔ زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں، آسمان میں ہوتے ہیں۔ اگر آسمان پر میری موت کا فیصلہ ہو گیا ہے تو مجھے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اور اگر وہاں میری زندگی کا فیصلہ ہو گیا ہے تو تم میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔"

عقیدۂ ختمِ نبوت اور ناموسِ رسالت کے دعویدار بے شمار ملیں گے۔ وہ بھی ملیں گے جنہوں نے اس عقیدے کی خاطر جانیں بھی لیں لیکن ساتھ ہی رحم کی درخواست بھی کرتے رہے۔ اس ساری تحریک میں صرف ایک نام ہے جو

اس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

کی تعبیر بنے رہے اور کبھی طاغوت کے سامنے سر نہ جھکایا اور وہ ہیں میرے سید صاحب۔

ان کے نکتہ چیں جس قدر ان پر تبرا بازی کرتے وہ سید صاحب کے حق میں اللہ تعالی کی رحمت ہی ثابت ہوتی۔ مخالفین کی دشنام طرازی، سننے والوں میں تجسس پیدا کرتی اور وہ متوجہ ہوتے کہ ایسی کیا بات کہی ہے۔ اور یہ مولانا کی تحریر کا اعجاز تھا کہ جو کوئی انہیں پڑھتا ہے ان کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک مثال مشہور قانون دان اے کے بروہی کی ہے۔ مولانا کے خلاف کسی مقدمے کی تیاری میں مولانا کی تحریر پڑھنا پڑی اور وہ مولانا کی تحریر، فکر اور شخصیت کے اسیر ہو گئے۔

اور جس قدر ان کے مخالف ہیں اس سے کہیں زیادہ بڑی تعداد ان صاحبان علم کی ہے جو مولانا کے دستر خوان کے خوشہ چیں رہے اور رفعتیں پا گئے۔ صرف تحریر کے میدان میں دیکھیں تو مولانا کے متاثرین کی ایک لامتناہی فہرست ہے جن میں ماہر القادری، نعیم صدیقی، اسعد گیلانی، جیلانی بی اے، ارشاد حسین حقانی اور بے شمار نام ہیں۔

بروہی صاحب کے علاوہ الطاف گوہر جیسے دانشور بھی مولانا کے فکری متاثرین میں سے ہیں۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جو مولانا کی زیرِ تربیت رہے پھر ان سے اختلاف بھی کیا لیکن مولانا کی عظمت و مرتبہ کے معترف بھی رہے۔ ان میں ڈاکٹر اسرار احمد اور جاوید غامدی جیسے نام بھی ہیں۔

جس خوبی، جامعیت اور دقتِ نظری سے سید صاحب نے شریعت اسلامیہ اور قرآنی اصول اور احکام کی تفسیر تعبیر کی اس کی نظیر ان کے ہم عصروں کے ہاں ہی نہیں، اسلام کی ہزار بارہ سو سالہ تاریخ میں بھی اس پیمانے پر کسی نے شاید ہی کام کیا ہو۔ انسانی زندگی کا ہر شعبہ چاہے وہ تعلیمی، تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی ہو یا اقتصادی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی ہو، سید صاحب کے ہاں ان کا اسلامی نقطۂ نظر سے گہرا مطالعہ نظر آئے گا۔ اور پھر موضوعات کا تنوع اور ہمہ گیری دیکھئے۔ الجہاد فی السلام، پردہ، سود، تنقیحات، تعلیمات، خطبات، اسلام اور ضبط ولادت، سنت کی آئینی حیثیت، اسلامی ریاست، خلافت و ملوکیت غرض ملت اور امت سے متعلق ہر موضوع پر مولانا کی تحریر جامعیت کے ساتھ ملے گی۔

سید صاحب کو خدا نے دین کا صحیح فہم عطا فرمایا تھا۔ قرآن میں غوطہ زن ہونے کی وجہ سے ان کی نظر سراسر اسلام کی نظر بن گئی اور پھر بقول ماہر القادری، تفہیم القرآن (جلد ا، جلد ۲، جلد ۳، جلد ۴، جلد ۵، جلد ۶) تو مولانا کے علم و فضل اور دینی بصیرت کی سب سے بڑی شہادت، سند اور صداقت ہے۔

سادگی، پر زور استدلال، متانت و سنجیدگی، عالمانہ وقار، زورِ بیان اور سلاست و شستگی غرض ایک تحریر میں جو خوبیاں ہیں وہ سید صاحب کے ہاں اعلی درجہ پر نظر آئیں گی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں تنقید بھی انہی پر ہوتی ہے۔ مولانا کوئی فرشتہ یا نبی نہیں تھے۔ ان سے بہت سی اجتہادی غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی۔ لیکن مولانا نے اپنی جانب آنے والے کسی پتھر کو نہیں لوٹایا۔ خاموشی سے سہنا لیکن اپنی بات سے پیچھے نہ ہٹنا۔ یہ وہی صفت ہے جو پیغمبروں میں ہوتی ہے۔ ہمارے دور کے ایک نابغہ اور فلسفی جناب احمد جاوید کے بقول کردار کی انتہائی بلندی، علم کا انتہائی اوج، ارادے کی انتہائی مضبوطی اور اخلاق کا انتہائی کمال تاریخ اسلام کی جن شخصیات میں جمع ہوئی ہیں، مولانا مودودی اس سلسلے کے آخری آدمی تھے۔

اسلام کی ہزار سال سے زیادہ کی تاریخ میں اپنی معاصر دنیا پر اثر انداز ہونے والی کوئی شخصیت مولانا کے برابر نہیں۔ آج چیچنیا، سوڈان، الجزائر، ترکی، مصر، انڈونیشیا یہاں تک کہ ایران میں احیائے دین کی جو تحریکیں بھی چل رہی ہیں، بلاشبہ سید صاحب ان تمام تحریکوں کے امام ہیں۔

سید صاحب کے بارے میں کچھ کہنے کی تمنا نجانے کب سے تھی لیکن جب بھی یہ خیال آتا زبان گنگ ہو جاتی، قلم زنگ آلود محسوس ہوتا اور اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا احساس شدید تر ہوتا چلا جاتا۔ اپنی عقیدت کو نجانے کب سے سینے میں دبائے ہوئے سوچتا رہتا کہ اتنی بڑی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہوئے کہیں قلم لڑکھڑا نہ جائے اور کوئی گستاخی سرزد نہ ہو۔

ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم اس عظیم شخصیت کے دور میں پیدا ہوئے جس کے ذکر سے دل و نگاہ احترام سے جھکتے چلے جاتے ہیں۔ مولانا کی زندگی تو مثالی تھی ہی موت بھی ایک مثال بن گئی۔ بفیلو، امریکا سے ان کا جسد خاکی جہاں جہاں رکا، لاکھوں لوگوں نے ان کی نماز جنازہ ادا کی اور شاید یہ واحد واقعہ ہے کہ میت کی موجودگی میں کئی جگہ نماز جنازہ ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ملت کو سیّد صاحب جیسی ہستی ملتی ہے یا نہیں:

دگر دانائے راز آید کہ ناید

رب کریم اس دانائے راز کی قبر کو اپنے نور سے بھر دے۔

الأوراق
ALAWRAAQ
Publications
www.alawraaq.com